ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ نویسی اور ادبی تاریخ کے نئے تصورات

خادم حسین

ABSTRACT:

Dr.Tabassum Kashmiri is renowned a scholar of Urdu literature. He is a poet, critic, researcher and literary historian. This article gives a meticulous analysis of *Literary History of Urdu Literature* written by him in the light of basic and vital principles of literary history and historiography. In this article we also discussed the multidimensional aspect of his history in the light of his vision, modern critical approach and his distinctive style. How and where this multidisciplinary study works? An attempt has been made to measure and encompass the depth and breadth of his literary history. This article also spotlights some singificant features of his writing.

Key Words:

Tabassum Kashmiri, Urdu Literary History, Critical Evaluation, Ram Babu Saksaina, Dr. M. Sadiq, Ali Jawad Zaidi, Dr. Saleem Akhtar

نسلِ انسانی کے ماضی، حال اور مستقبل کا انحصار اس کی سماجی، سیاسی، معاشی، تہذیبی اور ثقافتی ترقی سے عبارت ہے۔ ارتقا پذیری کا یہ عمل عام سطح پر تاریخ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ گویا تاریخ ان ہمہ جہت تبدیلیوں کا ایک سفر نامہ ہے۔ خالص انسانی تاریخ میں تہذیب، ثقافت اور زندگی کے دیگر پہلوؤں کو بیان کیا جاتا ہے۔ ادب کی تاریخ میں سماج اور اس سے منسلک دوسرے پہلوؤں کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ ان پہلوؤں میں ادب کی ترقی محض اصناف اور ادب کے زمانی ارتقا اور تنزل تک محدود نہیں ہوتی، بل کہ اس کے ارتقا میں اس عہد کا ادب، فنونِ لطیفہ، سماجیات، سیاسیات، معاشیات، تاریخ، علمی میراث، نفسیات، بشریات، علم الکلام، مقامی تہذیب اور دیو مالا کے

ساتھ ساتھ اس عہد کی تہذیب و ثقافت بھی شامل ہوتی ہے۔ ان پہلوؤں پر محیط ادبی تاریخ کو ادب کی تاریخ کا نیا تصور کہتے ہیں۔ جب ان نئے تصورات اور معیارات کی روشنی میں اُردو کی ادبی تاریخوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو صورت حال قابلِ ستائش نظر نہیں آتی ہے ،زیادہ تر ادبی مورخین کے ہاں تاریخ کے جدید تصور کا شعور موجود نہیں ہے۔ رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اُردو اعجاز حسین کی مختصر تاریخ ادب اُردو ڈاکٹر محمد صادق کی *A History of Urdu Literature*، ڈاکٹر سلیم اختر کی اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ،علی جواد زیدی کی *A History of Urdu Literature*،حسن اختر ملک کی تاریخ ادب اُردو اور ڈاکٹر انور سدید کی اُردو ادب کی مختصر تاریخ اُردو کی معروف تاریخوں میں شمار ہوتی ہیں۔ یہ تاریخیں تاریخ کے جدید تصور کو اس طرح بیان نہیں کرتی ہیں۔ ان میں شعرا اور ادبا کے حالات و کوائف کی جمع آوری اور محاسنِ کلام کا عمومی انداز نقد موجود ہے۔ جو تاریخ کے زمانی شعور اور خارجی عوامل کی عہد بہ عہد تصویر کشی پیش نہیں کرتا ہے۔ اداروں کی طرف سے شایع ہونے والی ادبی تاریخوں میں تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند (پنجاب یونی ورسٹی) اور تاریخ ادب اُردو (علی گڑھ یونی ورسٹی) شامل ہیں۔ ان ادبی تاریخوں کا بڑا مسئلہ ان پر کام کرنے والے افراد ہیں جن کے مضامین، بیان ، اسلوب اور شعور کے اختلاف کی وجہ سے تاریخی تسلسل قائم نہیں رہ سکا۔ ان تاریخوں میں اس عہد کے سماجی، سیاسی اور لسانی اثرات کا ذکر تو موجود ہے لیکن ان عوامل کا ایک اکائی کے صورت نظر نہ آنا انھیں تاریخ کے متوازن اور جدید تصور سے دور لے جاتا ہے۔

اُردو ادب کی نسبتاً بہتر تاریخوں میں اولیت ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اُردو کو حاصل ہے۔ انھوں نے تاریخ کے سماجی، اقتصادی، لسانی اور تہذیبی دھارے کو امتزاجی تنقید کے ذریعے پیش کیا ہے جس میں وہ ادب کی مختلف اصناف کے ارتقا ساتھ ساتھ ادبی تاریخ کے جدید تصورات اور معیارات کو بھی سامنے لائے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بعد ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اُردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ء لکھی ہے جس میں انھوں نے تاریخ کے جدید تصورات اور معیارات کو تاریخ کا حصہ قرار دیا ہے۔ وہ ان جدید تصورات کا ذکر اپنی تاریخ کے دیباچے میں واضح الفاظ میں کرتے ہیں۔ جس میں وہ ادبی تاریخ کے کُہنہ اور قدیم تصور کو یکسر رد کرتے ہوئے تاریخ کی تشکیل کا نیا تصور پیش کرتے ہیں۔ ان کی ادبی تاریخ کا محور اور مرکزی نکتہ تاریخ کا فرانسیسی دبستان ہے۔ اس جدت پسند فرانسیسی تصور تاریخ سے استفادے کا ذکر وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ فرانس کے انلس دبستان (Annales School) کے مورخین نے تاریخ کو اس کے محدود کلاسیکی تصور سے رہائی دلوائی اور اسے ایک وسیع تر علمی معنویت عطا کی۔ 1929ء سے 1989ء تک اس دبستان کی سرگرمیوں نے تاریخ کو ایک نئے رنگ و روپ سے سنوارا۔'' [۱]

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ انلس دبستان کے تمام تصورات خالص تاریخ سے متعلق ہیں۔ ان تاریخی تصورات میں کہیں بھی ادبی تاریخ کے تصورات نظر نہیں آتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنے تحقیقی

مزاج، وسیع مطالعہ، تاریخی شعور اور تنقیدی بصیرت کے ذریعے ادبی تاریخ کے نئے تصورات تشکیل دیے ہیں۔ ان نئے تصورات میں وہ ادبی تاریخ نویسی کے لیے شعبہ جاتی مطالعات کے بجائے بین الشعبہ جاتی مطالعات (Interd Disciplanry Studies) پر زور دیتے ہیں اور ادبی تاریخ میں ادبی، تاریخی، سماجی، تحقیقی، ثقافتی، تہذیبی اور تنقید کے الگ تصور کو تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کی رائے دیکھیے:

> ''جب ہم کسی خاص ادبی دور کا تجزیہ کریں گے تو اپنا تجزیہ محض ادب کے ایک شعبہ تک محدود نہیں رکھیں گے بل کہ ہم اس دور کے سماجی علوم، اقتصادیات، دیو مالا، سیاسی تاریخ، تہذیبی و ثقافتی عوامل، فلسفہ اور نفسیات وغیرہ کی روشنی میں اس عہد کا تجزیہ مکمل کریں گے۔''[۲]

ڈاکٹر تبسم کاشمیری ان علوم کو ادبی تاریخ نویسی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ تاریخ نویسی میں ادبی مرکزیت اور وسیع زمانی تناظر کے حمایت بھی کرتے ہیں۔ وہ ادبی مورخ لیے تاریخی شعور، تنقیدی بصیرت، ادبی تحقیق، تخلیقی صلاحیت، ماضی شناسی، متحرک شخصیت، بے مثل متخیلہ اور ذہنی بصیرت جیسی خصوصیات کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ وہ ادبی مورخ میں ادب کی تاریخ اور ادب کی تحقیق میں فرق کی صلاحیت بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادبی مورخ کی رائے ہر صورت، معتدل، متوازن مگر حقائق پر مبنی ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے تمام سوالات اور تصورات کی روشنی میں جدید ادبی تاریخ کا سب سے موزوں اور متحرک پہلو اس کا ''تنقیدی نظام'' ہے جسے وہ ایک ہمہ جہتی اور کثیر الجہاتی نظام نقد کہتے ہیں:

> ''مجھے عملی تنقید کو پیش کرنے کے لیے ایک تنقیدی نظام کو اختیار کرنے میں سوچ بچار کے عمل سے گزرنا پڑا۔ میرے پیش نظر ماضی اور حال کی ادبی تاریخیں تھیں۔ ان میں ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ اس اعتبار سے منفرد حیثیت کی حامل تھی کہ انھوں نے جدید نظامِ تنقید سے استفادہ کیا تھا۔ باقی تاریخیں تنقیدی اعتبار سے روایتی تنقید کی طرف مائل تھیں۔ مجھے ادبی تاریخ کی تفہیم میں بین الشعبہ جاتی علوم کو اختیار کرنا ہوگا۔ فلسفہ، نفسیات، سماجی تاریخ، ثقافتی تاریخ، سیاسی تاریخ، دیو مالا، اقتصادیات، اور دیگر علوم کی روشنی میں کسی عہد کے ادب کی تشریحات کرنا ہوں گی۔ مجھے ایک معیاری تنقیدی نظام کی تشکیل کے لیے تنقید کے مختلف شعبوں سے رجوع کرنا پڑا، مارکسی تنقید، دیو مالائی تنقید، نفسیاتی تنقید، نئی تنقید اور ساختیات کے ایک مرکب قسم کے نظام کو بروئے کار لا کر اُردو ادب کی تاریخ پر تنقید کی گئی۔''[۳]

اس بیان کی روشنی میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ کے دو بنیادی پہلو سامنے آتے ہیں۔ اول: معیاری اور بصیرت افروز نظام نقد، دوم: بین الشعبہ جاتی علوم وفنون سے استفادہ۔ ان دونوں پہلوؤں کی روشنی میں ان کی ادبی تاریخ کا نظامِ نقد ہمیں تنقیدی بصیرت کی طرف لے کر جاتا ہے۔ ان کی تاریخ میں نفسیاتی تجزیے نمایاں ہیں جس میں انھوں نے مختلف شعرا، ادبی رجحانات اور دبستانوں کے تجزیے پیش کیے ہیں۔ قلی قطب شاہ کے نفسیاتی تجزیے کے حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی رائے دیکھیے:

> ''ہر بڑے شاعر کے پیچھے کوئی نہ کوئی ایسی پُراسرار طاقت ضرور ہوتی ہے جو اس کے تخلیقی سرچشموں کا منبع و ماخذ ہوتی ہے۔ بعض اوقات ماضی سے محبت شعری طاقت کا سرچشمہ بن جاتی ہے اور کبھی ماضی سے نفرت شاعر کی قوتِ محرکہ قرار پاتی ہے۔ کبھی کبھی ناسٹلجیا (Nostalgia) ایک بڑی شاعری کا محرک بن جاتا ہے۔ مگر قلی قطب شاہ کی شاعری کا منبع و سرچشمہ جنس ہے۔ ہر انسان کا اپنا ایک باطنی مرکز ہوتا ہے اور وہ اس باطنی مرکز کی رہنمائی میں سفرِ حیات طے کرتا ہے۔ قلی قطب شاہ کا باطنی مرکز جنس ہے۔ درحقیقت جنس ہی اس کی شاعری کا باطنی اور بنیادی استعارہ ہے۔ اس کی شاعری ایک اوپیرا (Opera) یا رہس کی طرح سے ہے جس میں مختلف کردار اپنے خوب صورت ملبوس اور حسین بدنوں کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔''[۴]

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس نفسیاتی تجزیے میں قلی قطب کی شخصیت کے مرکزی نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ فرد کے باطنی مرکز کا سراغ لگایا ہے۔ جس کے ذریعے قلی قطب شاہ کی باطنی طاقت اور قوت ''جنس'' کو قرار دیا ہے۔ قلی قطب شاہ کے بعد انھوں نے مرزا محمد رفیع سودا کی شخصیت، ان کی حد سے بڑھی ہوئی انا (Ego) اور بے جا تفخر کو نفسیاتی حوالے سے اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''شخصی طور پر وہ حد سے بڑھی ہوئی خود پسندی (Egotism) میں مبتلا تھے لہٰذا جب بھی ان کی خود پسند (Egotist) شخصیت کو ذرا سی بھی ٹھیس لگتی تھی وہ مشتعل ہو جاتے تھے۔ خود پسندی کی اس جبلت کو تسکین دینے کے لیے سادیت پسندی (Sadism) پر اُتر آتے تھے اور جب تک وہ اپنے حریف کو اذیت نہ دے لیتے تھے ان کی خود پسندی کا رویہ مسلسل اضطراب اور اذیت میں مبتلا رہتا تھا۔''[۵]

مذکورہ بیان میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے سودا کی حد سے بڑھی ہوئی خود پسندی کو ذہنی اضطراب قرار دیا ہے جو انھیں عدم برداشت کی طرف لے جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ عمل سادیت پسندی جیسے عارضہ کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ سودا کے بعد ڈاکٹر تبسم کاشمیری، میر تقی میر کی شخصیت اور ان کے جنون کی کیفیت کا نفسیاتی جائزہ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

> ''یہ خیال کہ چاند سے ایک خوب صورت خاتون کا پیکر اتر کر میؔر کی طرف آتا تھا، جس سے آخر شب تک صحبت رہتی تھی، میر کا خبط (Obsession) تھا۔ نفسیات کے مطابق یہ Paranoia کی صورت تھی۔ ایسی کیفیت میں ذہنی حالت کی تبدیلی یا خلل کے سبب مریض کے ذہن میں ایسے خیالات آتے ہیں۔ جو اس کے اپنے بس میں بالکل نہیں ہوتے..... ایسے میں ذہنی مریض کی بے بسی بڑی اندوہ ناک ہوتی ہے۔ یہ بات اُس کے علم میں ہوتی ہے کہ وہ خبط کا شکار ہے... کوئی خاص تمثال اسے جکڑ لیتی ہے اور جوں ہی مریض اس تمثال کا سامنا کرتا ہے اجباری متخیلہ (Compulsive Imagination) کا عمل فوراً شروع ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں مریض کے متخیلہ میں داستانی رنگ بھی پیدا ہوسکتا ہے۔ اس میں فحش

(Obscence) تمثالیں بھی بن سکتی ہیں۔ میر اس ذہنی مرض کا شکار ہوئے تھے۔'' ۶

میر تقی میر کے جنون کو ان کا ذہنی خبط قرار دینے میں دو اہم باتیں قابلِ ذکر ہیں اول: خبط کی وجہ سے بے بسی ،دوم :اس ذہنی عارضہ کی وجہ میر کی قابلِ رحم شخصیت ۔میر تقی میر پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا نفسیاتی تجزیہ ان سے نفرت کے بجائے محبت کے پہلو کو سامنے لاتا ہے ۔میر تقی میر کے بعد وہ خواجہ میر درد کی صوفیانہ اور عشقیہ شاعری کا نفسیاتی تجزیہ اس انداز میں پیش کرتے ہیں:

''یوں لگتا ہے کہ ان کے اندر ایک بڑا عاشق ہمیشہ سے موجود تھا مگر صورت یہ بنی تھی کہ انتیس برس کی عمر میں انھوں نے لباس درویشی اوڑھ لیا تھا اور یہ ہی ان کا نقاب (Persona) بن گیا تھا۔ اس کے بعد عمر بھر یہ عاشق اس نقاب (Persona) کی نگرانی میں تو رہا لیکن تخلیقی عمل کے راستے نمودار ہو کر اپنے ہونے کا ثبوت مہیا کرتا رہا۔'' ۷

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے نفسیاتی تجزیے صرف افراد پر مشتمل نہیں ہیں بل کہ ان کا دائرہ کار مکمل عہد کے ساتھ ساتھ بادشاہوں اور رئیسوں کے نفسیاتی احوال تک وسیع ہے۔وہ لکھنوی تہذیب کو نفسیاتی حوالے سے اس طرح پر لکھتے ہیں:

''کسی بھی قوم یا گروہ کے لیے تہذیب و ثقافت کے اعلیٰ معیارات کے حصول کے لیے کم سے کم تین چیزوں کی ضرورت بہت اہم معلوم ہوتی ہے۔ وقت، ذوق اور پیشہ۔ اودھ کے مذکورہ بالا گروہ میں اتفاق سے یہ تینوں چیزیں بدرجہ کمال موجود تھیں۔ وہ معاش سے بے فکر تھے، اس لیے وقت اور فرصت کی کوئی کمی نہ تھی، ذوق ان کی طبع میں موجود تھا اور پیشہ وافر تھا۔ لہٰذا ان تینوں عوامل نے لکھنو کے اندر تفریحی ثقافت کی اعلیٰ نفاستوں کے معیارات قائم کیے۔ فرصت کے سبب یہ لوگ جنس کی طرف مائل ہوئے۔ ان کے شب و روز عیش و نشاط کی نذر ہوتے تھے۔ انھوں نے جنس کو بھی تہذیب و ثقافت کا ایک مظہر بنا دیا۔ ان کے اسی ذوق کی بدولت لکھنو کے کوچہ و بازار جنس سے آراستہ ہوتے گئے۔ ان کی محل سرائیں جنس کے نگار خانے بنتی گئیں اور یوں لکھنو کے پورے ماحول پر ایک جنسی ثقافت (Erotic Culture) کی چھاپ نظر آنے لگی۔'' ۸

لکھنوی تہذیب کے یہ اثرات فیض آباد پر بھی ہوئے۔لکھنوی تہذیب کے نفسیاتی تجزیے کے بعد ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اودھ کے حکمرانوں کا تذکرہ کرتے نظر آتے ہیں لیکن اس جنسی ثقافت کا سب سے زیادہ اثر شجاع الدولہ پر ہوتا ہے۔اس کی ذہنی کیفیت اور شہوانی صورتِ حال کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''نواب شجاع الدولہ کی جنسی زندگی انتہائی طور پر غیر معمولی تھی۔ شجاع الدولہ جنونِ شہوت (Erotomania) کا شکار تھا۔ ایسا شخص جنس میں مرضیاتی طور پر لامحدود اور ان تھک دل چسپی رکھتا ہے۔عورتوں میں اس مرضیاتی حالت کی نشانی کو Nymphomanis اور مردوں میں اس کو Satyriasis کہا جاتا ہے۔ شجاع الدولہ دیونفس سے بے حد عاجز تھے کہ خواہش

نفسانی اور غلبہ شہوانی کے وقت بے حواس و مدہوش ہو جاتے تھے۔''[۹]

نواب شجاع الدولہ کے حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے نفسیاتی لحاظ سے اس کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش کو ایک عارضہ قرار دیا ہے۔ اس میں شجاع الدولہ کی بدحواسی اور مدہوشی کا ذکر بھی موجود ہے۔ ایسی صورت میں انسان آدمی کے درجے سے گر کر حیوانی صورت میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایسی تہذیب میں عقل و خرد کے معاملات کیسے پروان چڑھتے ہوں گے؟ جہاں نوابوں، حکمرانوں اور رئیس زادوں کو شہوانی جذبات نے زیر کیا ہوا تھا۔ لکھنوی تہذیب اور اس کے اثرات کے بعد ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا دہلوی تہذیب اور ثقافت پر نفسیاتی تجزیہ اور رائے کو دیکھتے ہیں:

> ''دلی کے ادب میں Libido پر سپر ایغو (Super Ego) کا احتساب برابر موجود رہتا تھا۔ اور یہ سپر ایغو صدیوں تک ایک محتسب کی حیثیت سے اس تہذیب کی جبلتوں اور جذبوں کی تہذیب کرتی رہی اور اسی احتسابی عمل سے یہاں شاعری میں جذبات اور جبلتوں کے اظہار کا ایک قابل قبول تہذیبی معیار مرتب ہو گیا تھا۔ اس روایت سے انحراف کے باوجود یہاں کے تہذیبی معیار، سماجی دباؤ اور اخلاق و احتساب کی چھاپ شاعری پر واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔''[۱۰]

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ادبی تاریخ میں لکھنو کے جن دیگر شعرا کا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے ان میں انشا، جرأت اور رنگین کی شاعری بہت اہم ہیں۔ کہیں انشا کی غزل میں ثقافتی پابندیوں سے ہٹ کر غزل کا حقیقی تصور موجود ہے، کہیں جرأت کی محسوسات اور اس کے لمس کا جائزہ نظر آتا ہے جس میں ان کی حالت پر بے لاگ تبصرے موجود ہیں۔ رنگین کی ریختی کو ڈاکٹر تبسم اس عہد کے مردوں کی عورت سے بے زاری اور عورت کے مسائل سے ملاتے ہیں اور ہم جنسیت (Lesbianism) کے ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس مسئلے پر ڈاکٹر تبسم کی رائے دیکھیے:

> ''لکھنؤ کی عورت اس نوعیت کی نفسیاتی کیفیات کا شکار اس لیے بھی ہوئی تھی کہ مردوں کی کثیر تعداد گھریلو عورتوں کی جگہ طوائفوں سے جنسی ملاپ کو زیادہ پُرمسرت محسوس کرتی تھی لہٰذا گھروں میں جنسی ناآسودگی میں مبتلا عورتیں ہم جنسیت میں مبتلا ہو کر جنسی سکون کا مرحلہ طے کرتی تھیں۔''[۱۱]

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس ناآسودگی اور جنسی گھٹن کو رنگین کی ریختی کے کرداروں مثلاً دوگانا'الا بچی اور زناخی کے ذریعے واضح اشاروں سے سمجھایا ہے۔ وہ اس جنسی تہذیب کے بطن سے نکلنے والی' ریختی کی عورت' کا نفسیاتی تجزیہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> ''لکھنو کی جنسی تہذیب کے بطن سے ریختی کی جو عورت نمودار ہوتی ہے وہ از بس جنس زدہ ہے۔ اس کی پیاس نہ بجھنے والی ہے۔ ریختی میں ایک زن پُرشہوت (Nymph) نظر آتی ہے۔ جو اپنے مزاج کے اعتبار سے شبق النسا (Nymphomania) میں مبتلا دکھائی دیتی ہے۔ ریختی کی یہ عورت جنسی جبلت کی تسکین کے لیے زندہ ہے اور یہی اس کی زندگی کا واحد مقصد

ہے۔''[۱۲]

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے انفرادی اور اجتماعی سطح پر نفسیاتی مسائل کے تجزیے نفسیاتی تنقید کے ذریعے پیش کیے ہیں۔ انھوں نے ان نفسیاتی تجزیوں سے افراد، تہذیب ومعاشرت اور حکمرانوں کو اُردو ادب کی تاریخ کے اہم نفسیاتی کرداروں کے طور پر پیش کیا ہے۔

نفسیاتی تجزیات کے بعد ان کی تاریخ میں خالص تاریخ، تہذیب، سماج اور دیو مالا یا مقامی تہذیب ومعاشرت کے ذکر تلاش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری ''امیر خسرو'' کے حوالے سے ہند اسلامی تہذیب اور مقامی لوک ثقافت کا ذکر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''ہندوی کلام کی سند سے قطع نظر امیر خسرو برصغیر کی ہند اسلامی تہذیب میں ایک اساطیری شخصیت کے طور پر کئی صدیوں سے زندہ ہیں۔ ان سے منسوب کلام کی لوک روایت نے ان کو ایک ہر دل عزیز شخصیت بنائے رکھا ہے اور ان کے صوفیانہ تشخص نے ان کو ایک بے مثل صوفی کی حیثیت دے رکھی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ محققین کے اعتراضات کے باوجود امیر خسرو برصغیر کی لوک ثقافت اور ہند اسلامی تہذیب کا ایک انتہائی معتبر نام ہے۔''[۱۳]

امیر خسرو کے ہندوی کلام کو ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مقامی لوک ثقافت اور دساتیر سے ملا کر پیش کیا ہے۔ محققین کی آرا میں اختلاف سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انھوں نے امیر خسرو کو ہندوستانی ادب کے نمائندے اور ہندوستانی انسان کے طور پر پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے امیر خسرو کو باوجود اختلافات کے برصغیر کی مقامی ثقافت اور ہند اسلامی تہذیب کا معتبر نام قرار دیا ہے۔ ان کی یہ رائے اس تنقیدی اصول کے تابع ہے جس کا ذکر انھوں نے دیباچے میں کیا تھا کہ ادبی مورخ ہمیشہ متوازن رائے قائم کرے۔ جو قبول کے درجے کی سند رکھتی ہو۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کسی عہد کا تاریخی تجزیہ معروضیت سے پیش کرنے کے حق میں ہیں۔ مغلوں کے زوال کے اسباب پر ان کی صائب رائے دیکھیے:

> ''ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کو ہم کسی واحد وجہ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ زوالِ سلطنت کا تجزیہ کریں تو اس میں بہت سے عوامل کارفرما ملتے ہیں۔ مختلف ادوار میں مورخین اس زوال کے اسباب کو اپنی اپنی سیاسی سوچ اور مفادات کے حوالے سے تعبیر کرتے رہے ہیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں برطانوی مفادات کے تحفظ کے لیے عالم گیر کی مذہبی حکمتِ عملی اور فرقہ واریت کے تصور کو فروغ دیا جاتا رہا۔ اس کلاسیک تصور کو علی گڑھ کے مورخین ڈاکٹر ستیش چندر اور ڈاکٹر اطہر علی نے ۱۹۶۰ء کی دہائی میں دستاویزی شہادتوں سے رد کیا۔ انھوں نے مغل دربار کی گروہ بندیوں، جاگیرداری نظام کے زوال اور دکنی فتوحات کے بعد نئے منصب داروں کی کثرت اور اراضی کے فقدان کے سبب سے پیدا ہونے والے جاگیرداری اور عسکری بحران کا تصور پیش کیا۔ اگرچہ یہ تصور چیلنج بھی ہوا مگر اس کی صداقت اپنی جگہ موجود ہے۔''[۱۴]

اوپر ذکر کیے گئے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کسی تاریخی عہد کا تجزیہ کرتے ہوئے معروضیت کو ملحوظ رکھتے ہیں اور مختلف آرا کی روشنی میں متوازن رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ نہ خود مسائل میں الجھتے ہیں اور نہ ہی اپنے قاری کو اس الجھن میں ڈالتے ہیں۔ ایہام گو تحریک کن اسباب اور وجوہات کی بنا پر پیدا ہوئی؟ وہ اس کی ادبی روایت کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس تحریک کے پیدا ہونے کی سب سے اہم وجہ اس دور کی تہذیبی صورت کو قرار دیتے ہیں:

> ''محمد شاہی عہد کے تہذیبی اثرات سے معاشرے میں شعریت کے رجحان نے جڑ پکڑ لی تھی اور اس رجحان نے تیزی کے ساتھ پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس رجحان کے اثرات دلی کی تہذیب میں ذومعنویت کو فروغ دے رہے ہیں جو ایہام جیسی صنعت کے لیے نہایت سازگار فضا بنا رہے تھے۔''[۱۵]

مذکورہ بیان میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ایہام اور ذومعنویت کو محمد شاہی عہد کے تہذیبی اثرات سے منسلک کیا ہے اور اس کی بنیادی وجہ اس عہد کے ہر شعبہ زندگی میں شاعری کے غالب رجحان کو قرار دیتے ہیں۔ وہ مرزا محمد رفیع سودا کی ادبی سماجیات کا ذکر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''سودا اپنے عہد کی ادبی سماجیات کی ایک بڑی پہچان ہے۔ وہ ایک ایسا شاعر تھا کہ جس نے مغلوں کے زوال کے آغاز میں آنکھ کھولی تھی اور دلی میں عالم گیر ثانی کے عہد (۵۹-۱۷۵۴ء) تک مقیم رہا تھا۔ بادشاہت کے ادارے کا جو وقار اس کے بچپن میں موجود تھا۔ اس کی جوانی کے ابھرنے اور ڈھلنے کی منزلوں میں پہنچنے تک اپنی آخری ذلت، تباہی اور گراوٹ تک جا پہنچا تھا..... بل کہ اپنی بدعنوانیوں کے باعث بُری طرح معتوب بھی ہوئے۔ گھوڑے کی طرح محمد شاہی دور کا ''ہاتھی'' بھی ضعف و ناتوانی، فاقہ کشی، کسالت اور بدہیتی کا شکار ہے۔ تاریخی زوال کی رفتار انسانوں اور ان کی تہذیب کے ساتھ ساتھ جانوروں میں برابر نظر آتی تھی ... سودا کا ''شہر آشوب'' ہندوستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی زوال پر لکھا جانے والا پُر درد نوحہ ہے۔ یہ ''شہر آشوب'' سودا کی سماجی بصیرت کی ایک یادگار ہے۔''[۱۶]

مذکورہ بالا بیان میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے میں ادب اور سماج کے تعلق کا ذکر کیا ہے۔ بڑا ادب ہمیشہ سماج اور تہذیب کے مسائل کے ادراک اور ان کے حل پر زور دیتا ہے۔ سودا کی سماجی بصیرت اور تاریخی شعور نے انھیں تہذیبی سطح پر پیدا ہونے والی غیر یقینی صورتِ حال کا ادراک دیا جہاں پر انھوں نے کسالت اور غربت کا تذکرہ کیا۔ زوال پذیر معاشرت، سماج اور تہذیب میں اداروں کا زوال، انسانوں کا زوال، انسانی قدروں کا زوال اور دوسری چھوٹی چھوٹی قدروں کا زوال اس عہد کی مکمل تصویر پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ ان وجوہات کی بنیاد پر کسی معاشرت کے روبہ عروج یا زوال ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کے تہذیبی زوال کا ذکر ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھنو کے مذہبی رویوں کی صورت میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''عجمی تہذیب کے باطنی پہلوؤں میں جھانکیے تو اس سے ایک طرف ''یاحسینؑ'' کے نام سے الم

ناک چیخیں اور نوحے بلند ہوتے ہیں اور پورے منظر پر ایک گہری اداسی اور حزن و یاس کی کیفیت طاری نظر آتی ہے مگر جب یہ عرصۂ ماتم گزر جاتا ہے تو دوسری طرف سے نغمہ و رقص اور کیف و نشاط کی خوش کُن آوازیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ یہ ہی لکھنوی تہذیب کا باطن تھا جس میں وقفے وقفے کے ساتھ یہ دونوں آوازیں سُنی جاسکتی ہیں۔ حسینؓ اس تہذیب کے لیے شجاعت، وقار، حق پرستی اور شہادت کا آئیڈیل تھا۔ یہ تہذیب حسینؓ کی شہادت پر نوحہ کناں رہی اور ماتم کرتی رہی لیکن حسینؓ جیسی شجاعت و حق پرستی کو اختیار نہ کرسکی۔ حسینؓ کی ذات کی ان اعلیٰ ترین صفات کی نفی اس تہذیب کا ایک تضاد بن گیا تھا۔ نوحہ گری اور ماتم پرستی کی روایت نے اس تہذیب کے اندر خود اذیتی کو پیدا کیا اور اس تہذیب کے پیروکاروں میں ایک مجہول انفعالیت کو فروغ ملا۔'' [۱۷]

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے لکھنوی تہذیب کے اس اہم مذہبی پہلو کو نہایت محتاط مگر حقائق کی روشنی میں علمی و فکری سطح پر پرکھ کر نتائج برآمد کیے ہیں۔ جب کسی معاشرت، سماج اور تہذیب میں فرار اور تضاد کا عنصر زیادہ ہوجاتا ہے تو ایسی معاشرت ان اقدار کو دلی طور پر تسلیم نہیں کرتی جو اس کی ترقی کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ یہی صورت لکھنوی تہذیب کے ان عناصر کی ہے۔ مزید برآں ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھنو کی فکری اور عسکری مجہولیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''مجہول سوسائٹی وہ ہے کہ جو غیر تخلیقی ہو، بنجر ہو اور فنی عمل سے محروم ہوچکی ہو یعنی تہذیبی اور ثقافتی عمل رک چکا ہو اور وہ غیر متحرک ہوکر ماضی کی روایات میں معلق اور ساکن ہوگئی ہو اور معاشرتی عمل میں آگے بڑھنے کی صلاحیتوں سے محروم ہو اور اپنے اندر کا حرکی نظام زائل کرچکی ہو۔ کسی ایسی سوسائٹی کو ہم ثقافتی سطح پر مجہول سوسائٹی کا نام دے سکتے ہیں۔'' [۱۸]

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے لکھنوی تہذیب و ثقافت کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک معیار مقرر کیا ہے اور اس حقائق پر مبنی دلائل کی روشنی میں متوازن رائے قائم کی ہے۔ وہ لکھنوی تہذیب میں فکری اور عسکری مجہولیت کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن حقائق اور دلائل کی روشنی میں سفر کرتے ہوئے وہ کبھی کسی سے مرعوب نظر نہیں آتے ہیں۔ لکھنوی دبستان کے ادبی مقام پر ان کی رائے انتہائی قابلِ غور ہے:

''شمالی ہند اور پاکستان کے نقاد لکھنو کی شاعری کو بالعموم بڑی آسانی سے مبتذل، عامیانہ اور سوقیانہ قرار دیتے ہیں۔ اس میں بھی شک نہیں کہ اس شاعری کا بیشتر حصہ اسی نوعیت کا ہے مگر یہ سب کچھ نہیں ہے۔ مصحفی، آتش، ناسخ، انشا اور نسیم بھی اسی شعری روایت کے شاعر تھے اور یہ شاعر تاریخ کے زندہ رہنے والے اوراق میں محفوظ بھی ہیں۔ رنگین یا (جان صاحب) جیسے مبتذل اور سوقیانہ مزاج کے شاعر تاریخ کی کم زور اور ادنیٰ درجے کی روایات کے شاعر ہیں۔ ادب کی تاریخ میں ان کا ذکر تو آسکتا ہے مگر وہ نمائندگی کی مثال نہیں بن سکتے ہیں۔'' [۱۹]

ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھنوی شاعری کے ادبی مقام کا ذکر کرنے کے بعد اس بات کو مزید آگے بڑھاتے ہیں کہ شمالی ہند

کے نقاد دراصل ''دبستانِ لکھنو'' سے تعصب کی بنیاد پر اسے عامیانہ اور سوقیانہ قرار دیتے تھے اور ان شمالی ہند کے نقادوں کی دیکھا دیکھی پاکستانی نقادوں نے بھی ان کی اندھی تقلید کی ہے۔ نقادوں کے اس تقلیدی رویے کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''دبستان لکھنؤ کے خلاف تعصب کی پہلی اینٹ حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کی اشاعت سے رکھی گئی تھی۔ اس کے بعد یہ اینٹیں رکھنے کا سلسلہ جاری رہا اور رفتہ رفتہ ایک دیوار کھڑی ہوگئی۔ جائز و ناجائز تعصّبات کی یہ دیوار اب اتنی اونچی اور اتنی مضبوط ہوچکی ہے کہ اسے گرا کر حقیقت کا اصل رخ دیکھنا آسان نہیں ہے۔ پچھلی ایک صدی سے نقادوں کے پیہم ستم کے باعث اس دیوار کو اب دیوارِ ستم کہا جاسکتا ہے اور اس دیوارِ ستم کو ہٹانا کوہِ گراں کو ہٹانے سے ہرگز کم نہیں ہے۔''[۲۰]

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مذکورہ بالا رائے میں شمالی ہند اور پاکستانی ناقدین کے اس تعصب پر مبنی آرا کی ہر لحاظ سے بیخ کنی کی ہے۔ وہ اپنی تنقیدی بصیرت کے تحت اس فیصلے پر پہنچے ہیں کہ لکھنو کا شعری دبستان دراصل دلی کے نقادوں کے ہاتھوں پچھیڑا گیا۔ دلی دبستان کے ناقدین اپنے کلاسیک تصورات، الگ تہذیبی اور ثقافتی معیارات کو لکھنو کے مختلف تہذیبی اور ثقافتی معیارات پر نافذ کرنے کی کوشش میں ایسی آرا قائم کرتے تھے جو کہ فکر اور دانش کے اعتبار سے درست نہ تھا۔ حق تو یہ ہے کہ لکھنو کے دبستان میں جتنا حصہ سوقیانہ اور عامیانہ ہے اسے یہ کہنا بجا ہے لیکن جو عمدہ، اعلیٰ اور بہترین ہے اس کا اعتراف بھی لازم ہے۔ لیکن لکھنو کے دبستان سے متعلق قائم ہو جانے والی رائے کو یکسر بدلنا ممکن نہیں ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے نفسیاتی، تہذیبی اور مختلف تنقیدی تجزیے متوازن رائے پر مبنی ہیں۔ انھوں نے نفسیات، سماج، تہذیب، تنقید، تاریخ اور تنقید کے امتزاجی بیان کے ذریعے بصیرت افروز تجزیے پیش کیے ہیں جو ہمہ جہتی تنقیدی شعور اور بصیرت کے بغیر ممکن نہیں۔ ان تنقیدی تجزیات کے بعد ان کے لسانیاتی تجزیوں کی طرف بڑھتے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے زبان کے لسانیاتی اور سماجی اثرات کا ذکر اردو ادب کی تاریخ میں بارہا کیا ہے۔ نیز وہ زبان کے ارتقائی سفر کا جائزہ بھی پیش کرتے ہیں مگر کچھ ایسے مباحث بھی ہیں جہاں ان کے ہاں خالص لسانیاتی یا قواعدی مباحث دیکھے جاسکتے ہیں۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ کے بارے لسانیاتی مباحث اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''نظامی کے لسانیاتی ڈھانچہ پر بہمنی دور اور بعد ازاں گول کنڈہ اور بیجاپور کے شعرا اپنی شاعری کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اسی روایتی ساخت پر نظامؔی کے ہاں جو افعال استعمال ہوئے ہیں، وہ فیروز اور اس کے بعد آنے والے شعرا میں بھی مستعمل رہے ہیں۔ اسی طرح سے اہم فاعل بنانے کے لیے فعل کے ساتھ ''ہار'' کا استعمال جیسے کنہیا'' لاحقے میں ''پن'' جیسے ''بال پن'' سابقے میں ''پتر'' ''تز'' وغیرہ لگا کر جیسے ''پردیس'' نرملا، نکھنڈ۔ اسم ضمیر میں ''ہمن'' تمن، سوں''

''نین'' توں، الیہ اور حرف جار میں لگ (تک) تھیں (تھی) تے (سے) منہ (مانہ) ماں (میں) سیتی، ستیں (سے) کا استعمال۔حقیقت یہ ہے کہ اگر نظامی کے لسانیاتی ڈھانچہ کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو پھر قدیم اُردو کو سمجھنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔''[۲۱]

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کسی عہد کی بڑی تصنیف پورے عہد کو لسانیاتی لحاظ سے سمجھنے کے لیے کافی ہوتی ہے؟ اس حد تک تو یہ بات درست ہے کہ ایک عہد کا لسانیاتی ڈھانچہ پورے نظام کو سمجھنا نسبتاً آسان بنا دیتا ہے لیکن یہ بیان ایک مدلل اور ٹھوس دلیل کا محتاج ہے جس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری سرور کے فسانہ عجائب کے صوتی بہاؤ اور آہنگ کا تذکرہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''سرور لفظوں کے صوتی بہاؤ میں لاشعوری طور پر بہہ جاتے ہیں۔ جہاں کوئی موثر صورت پیدا ہوئی سرور فی الفور اس کے بہاؤ میں ہم صوت، ہم آہنگ اصوات کے الفاظ بہانے لگتے ہیں، یہ ان کے مزاج کا بھی خاصہ ہے اور اس تہذیب کا بھی کہ جس میں وہ پروان چڑھے تھے۔ وہ ذرا سے بھی صوتی آہنگ سے ہم صوت لفظوں کی رواں دواں تراکیب پیدا کر دینے پر قادر تھے۔''[۲۲]

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے سرور کے متن کو سامنے رکھتے ہوئے اس کی اصوات کا لسانی تجزیہ پیش کیا ہے اور ان اصوات کے آہنگ اور لفظوں کے میل سے نئی اور رواں تراکیب کا ذکر کیا ہے جو ان کے لسانیاتی علم اور تجربے کا عکاس ہے۔ انھوں نے تہذیب، شخصیت اور لسانی علم کے حوالے سے اپنی بات کو تقویت بخشی ہے کہ لفظوں کی فطری بندش اور بناوٹ ان میں حُسن پیدا کرتی ہے لیکن بے جوڑ اور غیر فطری ڈکشن سے ادب پر برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری، انشا اللہ خاں انشا کی لفظی بازی گری اور ان کے ذریعے تخلیق کیے گئے ادب اور شعریات پر تبصرہ اس انداز سے کرتے ہیں:

''دوسروں کو لفظی عجائبات کا کرشمہ دکھا کر چونکا دینے والا شاعر اپنی خود بینی و خود نمائی کے نشہ میں جو کچھ کرتا رہا، اسے شاعری سے بہت کم تعلق تھا۔اپنے لفظوں کی بنائی ہوئی دنیا میں وہ اپنا عکس دیکھ کر سرشار رہتا تھا۔لکھنو کی تہذیبی سرگرمیوں اور خود اس کی اپنی ہنگامہ خیزیوں نے اسے فرصت ہی نہ دی کہ وہ اپنی شاعری کے المیہ پر کبھی سوچ سکتا۔ وہ شخص کہ جس کی طباعی اور جودتِ طبع کی ہندوستان میں دھوم تھی۔ شاعری کے نام پر وہ جو کچھ لکھتا رہا۔ درحقیقت وہ شاعری سے زیادہ منظوم لسانیاتی مشقیں تھیں۔''[۲۳]

اختصار کے پیش نظر ان مثالوں پر اکتفا کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ یہاں پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تنقیدی آرا کے اس حصے پر بات کرتے ہیں جو بے لاگ آرا پر مشتمل ہے ہیں تاکہ واضح ہو سکے کہ وہ اپنے موقف پر کس حد تک قائم ہیں۔نظیر اکبر آبادی کی شعریات جس بنیادی مسئلہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں ۔وہ انسانی بھوک اور روٹی کا مسئلہ ہے جس میں انسان اور آدمی کا تعارف بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر تبسم، نظیر کے آدمی کو آدرشی آدمی نہیں کہتے ہیں بل کہ

ان کا آدمی ایک عام آدمی ہے اور اس کے خصائص کا ذکر ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، آل احمد سرور کے اس بیان ''آدمی نامہ تو ایک طور پر انسانی دوستی کی ایسی دستاویز ہے جو یورپی ہیومنزم کے چارٹر سے پہلے وجود میں آئی۔''[۲۴] سے واضح اختلاف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

> ''سرور صاحب کے اس بیان میں مبالغہ نظر آتا ہے۔نظیر کا ''آدمی نامہ'' انسانیت کا کوئی چارٹر نہیں ہے نہ ہی انسانی حقوق کا کوئی ذکر اس میں موجود ہے۔نظیر کا کام محض اتنا ہے کہ اس نے اٹھارہویں صدی کے سیاسی اور اقتصادی زوال میں پیدا ہونے والے آدمی کے اعمال کی اچھی اور بری تمثالیں بہ یک وقت دکھا دی ہیں۔''[۲۵]

اُردو ادب کی تاریخ میں اور بعض دوسرے نقاد آتش کو لکھنؤ کا نمائندہ قرار دیتے ہیں۔ڈاکٹر تبسم کاشمیری ان کے تلامذہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

> ''آتش اور ناسخ کے تلامذہ ان کی رونق بڑھاتے تھے۔لکھنو کے ادبی افق پر آتش کی موت کے بعد بھی ان کی شاعری کی گونج سنائی دے رہی تھی۔مگر یہ بات اپنی جگہ سچ ہے کہ آتش کی نسبت لوگ ناسخ سے زیادہ متاثر نظر آتے تھے۔ ناسخ کی شعری شریعت کے نفاذ کے بعد لکھنو کی اردو شاعری نہایت خلوص کے ساتھ ناسخ کی پیروی میں مصروف ہو چکی تھی۔ اور حال یہ تھا کہ غالب اور شیفتہ جیسے بلند شاعر اور شعری بصیرت سے مالا مال فن کار بھی ناسخ کے لسانی سحر سے مسحور ہو چکے تھے۔''[۲۶]

ناسخ کی لسانی شریعت کے نفاذ کو ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ایک سحر قرار دیا ہے اور اس سحر کے اثرات شاہ نصیر کے ذریعے دلی تک بھی پہنچے تھے اور دلی کے معتبر فن کار اور شاعروں نے اس کے اثرات کو قبول بھی کیا تھا۔ابراہیم ذوق کی غزل کے عوامی رنگ پر برملا تبصرہ کرتے ہوئے تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> ''اُردو میں اگر کسی شاعر کو ''عوامی غزل گو'' کہا جاسکتا ہے تو وہ صرف ذوق ہے۔ میر نے اگرچہ عوام سے گفتگو کا دعویٰ کیا تھا مگر یہ دعویٰ دور دور سطح تک تھا البتہ خواص کے لیے وہ مکمل طور پر پسندیدہ شاعر تھا۔''[۲۷]

ابراہیم ذوق کے اس عوامی تغزل کی وضاحت اس انداز میں بیان کی ہے۔اس دور کے عوامی مسائل، روزمرہ، محاورہ اور عوام کی سطح کی باتیں ایک طرح سے تہذیب کا حصہ ہوا کرتی ہیں اس لیے ذوق کی غزلیں عوام کو ان ذہنی سطح پر متاثر کرتی تھیں اس لیے عوام میں بہت مقبول ہوئیں۔ جہاں تک شاعری میں فلسفیانہ مسائل،نفسیاتی مسائل اور داخلی تجربات کا ذکر ہے اس حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ذوق کو تہی دامن قرار دیتے ہیں اور بغیر کسی تامل کے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

> ''ذوقؔ کی غزل میں تجربے کی وہ داخلی آنچ اور حرارت موجود نہیں ہے کہ جس سے میرؔ اور غالبؔ کی غزل ہمیں متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ میرؔ اور غالبؔ نے زندگی کو ایک آشوب

مسلسل کی صورت میں دیکھا تھا۔ اسی آشوب کے سبب ان کی غزل ''آگ''، ''دھوئیں''، ''راکھ'' اور ''خون'' کے استعارے کثرت سے بناتی ہے۔ ذوق کی غزل مستقل طور پر ایک پرسکون ماحول کو پیش کرتی ہے۔ میر و غالب کے مقابلہ میں ذوق کی زندگی مکمل طور پر ہم وار گزری تھی۔ جب کہ غالب کے ہاں خواہشوں کے جمگھٹے لگے رہتے تھے اور وہ اپنے ارمان کم نکلنے پر شاکی رہتا تھا۔''[۲۸]

ڈاکٹر تبسم اردو ادب کے نامور ناقدین کی آرا سے اختلاف کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں :

''شاہ نصیر، ذوق اور داغ کو ادبی تاریخ کے تناظر میں رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ زبان کے عشق اور طرزِ ادا پر فریفتگی کے سبب یہ لوگ حقیقی شاعری سے دور ہٹے ہوئے ہیں۔ شاہ نصیر سے داغ تک اُردو شاعری زبان و بیان کے مزے اور چٹخارے کی اسیر ہو جاتی ہے۔''[۲۹]

ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اس بیان میں شیفتہ، فراق، عابد علی عابد اور تنویر احمد علوی کی آرا سے اختلاف کیا ہے۔ انھوں نے سید عابد علی عابد کی اس رائے سے بھی اختلاف کیا ہے جس میں انھوں نے داغ کی لسانی روایت کو اقبال تک پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کے بقول ''اقبال اس وقت اقبال بن سکا جب اس نے زبان اور طرزِ ادا کے اس پرانے شعری اسلوب سے نجات حاصل کی۔''[۳۰] ڈاکٹر تبسم کاشمیری جرأت اور مومن کے حوالے سے اردو ادب کے ناقدین کی آرا سے واضح اختلاف کرتے نظر آتے ہیں۔ مصطفیٰ خان شیفتہ اور دیگر نقاد مومن کو جرأت کا پیرو قرار دیتے ہیں اور اس کی معاملہ بندی اور عشقیہ شاعری کو اوباشوں کی شاعری قرار دیتے ہیں جب کہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری ان دو تجربوں کو دو مختلف تہذیبی رویوں سے یاد کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی رائے دیکھیے :

''وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو، کو رنگِ جرأت کا اثر قرار دینا یوں ہے کہ جیسے دو مختلف تہذیبی رویوں کو آنکھ بند کر کے ایک جیسا سمجھ لیا جائے۔ مومن کے ساتھ اس سے بڑی ناانصافی نہیں ہو سکتی کہ اس کی عشقیہ شاعری کو جرأت کی سراپا گر شاعری کے تیز جنسی رنگ سے ملا دیا جائے۔''[۳۱]

مومن کی شاعری میں جرأت کے اثر کا ذکر شیفتہ، نیاز فتح پوری اور اثر لکھنوی جیسے ناقدین کے ہاں ملتا ہے۔ جس کی تردید ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے دلائل سے کی ہے اور مومن کی شعریات پر ایک مدلل اور متوازن تبصرہ پیش کیا ہے۔ ان کی یہ رائے اس بات کی توثیق کرتی ہے کہ ادبی تاریخ کے نقاد کو بلا خوف اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنے رائے کا اظہار کرنا چاہیے اور اپنے موقف میں غیر موزوں اور غیر متوازن رویہ نہیں اپنانا چاہیے۔ میر انیس اور دبیر کے مرثیہ کی فصاحت، بلاغت، رد و قبول، شہرت اور عظمت کا ذکر ڈاکٹر تبسم کاشمیری اس نداز میں بیان کرتے ہیں:

''مرزا دبیر کے فن کا زوال بھی ان کی موت کے ساتھ ساتھ شروع ہو چکا تھا۔ لکھنو کے دبستان کا زوال دبیر کا زوال بھی تھا۔ انیس کے لیے یہ خوش قسمتی کی بات تھی کہ 1873ء میں ''انجمن پنجاب'' نے زبان کی سلاست، سادگی، فصاحت اور فطری شاعری کا جو تصور پیش کیا تھا وہ انیس

کی شاعری سے مماثلت رکھتا تھا۔ لہٰذا اس بدلے ہوئے ادبی منظر میں انیس کی شاعری کے لیے مستقبل میں روشن بشارت موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے ربع آخر سے بیسویں صدی کے ربع آخر تک وہ اردو مرثیہ کے افق پر یکساں طور پر موجود رہے۔ ان کی شاعری ان کی تخلیقی بصیرت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔''[۳۲]

مرزا دبیر اور میر انیس کی شاعری کا بنیادی فرق زبان کی سادگی اور اس عہد کا بدلتا ہوا ادبی منظر نامہ تھا۔ جس کے پیچھے مغربی شعری اثرات تھے۔ حالی اور آزاد کی سادہ بیانی اور فطرت نگاری کی وجہ سے انیس کا مرثیہ عروج پر رہا۔ دبیر کے ہاں شوکت الفاظ اور کلاسیک شعری روایت کا تصور موجود تھا جو کہ فی زمانہ رائج نہ تھا۔

ادبی تاریخ کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اس میں Readibility موجود ہو۔ اردو ادب کی تاریخ میں موجود اس خصوصیت کا کھوج لگاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس میں یہ خوبی کس قدر پائی جاتی ہے اور اگر نہیں تو اس کی کیا وجوہات ہوسکتی ہیں۔ڈاکٹر محمد حسن اُردو ادب کی تاریخ کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے ''شگفتہ اسلوب'' کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

''علاوہ بریں جو بات اس تاریخ کی دل آویزی میں مزید اضافہ کرتی ہے وہ اس کا شگفتہ اسلوب ہے جو تحقیق کی خشکی کے بجائے ادبی تاریخ میں تفہیم اور تجزیے کی روشنی پیدا کرتا ہے اور مصنف کی تاریخ، تحقیق اور تنقیدی شعور تینوں کے مزاج سے نیا مرکب تیار کرتا ہے۔ یہی نہیں اس ضمن میں بعض ادبی تصانیف کے سلسلے میں تخلیقی تنقید کا اسلوب بھی بہت ہی دل کش اور بلیغ ہے۔''[۳۳]

ڈاکٹر محمد حسن کی رائے میں ان کا اسلوب شگفتہ تخلیقی تنقید پر مشتمل ہے جو دل کش اور بلیغ بھی ہے۔دراصل یہ مرکب اسلوب ان کے تاریخی وژن، تحقیقی بصیرت اور تنقیدی شعور سے عبارت ہے ۔ ڈاکٹر فخر الحق نوری اپنے مضمون میں اسلوب کی تخیل آرائی کے متعلق لکھتے ہیں:

''اُردو ادب کی تاریخ اپنے اسلوب کے اعتبار سے بھی جاذب توجہ ہے۔تبسم کاشمیری نے ادبی تاریخ لکھتے ہوئے ایسا علمی طرز نگارش اختیار کیا ہے جس میں مناسب مقدار میں مذکورہ پہلوؤں کی آمیزش بھی محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے تکلف سے عاری اور دل چسپی پیدا کرنے والے عناصر سے معمور سلیس اور رواں دواں اندازِ تحریر اپنایا ہے جس نے علمی عبارت کو بوجھل اور ثقیل ہونے سے محفوظ کر دیا ہے۔''[۳۴]

ڈاکٹر ریاض قدیر اپنے مضمون ''اُردو ادب کی تاریخ اور تاریخی وژن'' میں اسی بات کو مختلف پیرائے میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ جس کا مطلب بھی مصنف کا طرزِ تحریر اور انداز نگارش ہی ہے:

''اُردو ادب کی تاریخ کے مطالعہ سے اس بات کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ مصنف ایک عرصہ برصغیر پاک و ہند کے ماضی کی ادبی و ثقافتی دنیا میں کھویا رہا ہے۔ تاریخ کی کتابوں کی

ورق گردانی کرتا رہا ہے ماضی کے کرداروں کے ساتھ اٹھا بیٹھا ہے۔ بیجا پور، گول کنڈہ، گجرات، دلی اور لکھنو کے تاریخی مقامات گلیوں اور محلوں میں گھوما پھرا ہے۔ پھر ان مقامات اور افراد کے احوال و واقعات کی تصویریں اس طرح کاغذ پر کھینچ کر رکھ دی ہیں۔'' [۳۵]

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ادبی تاریخ کے اسلوب پر مختلف آرا کے بعد ان کی تاریخ میں سے ان کے اسلوب کے چیدہ چیدہ نمونے ناقدین کی آرا کی توثیق کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ ولی دکنی کے متعلق رائے دیکھیے:

''ولی وہ شاعر ہے جو شمالی ہندوستان اور دکن کے دوراہے پر کھڑا ہے۔ شمالی ہند کی فارسی روایت اسے چکا چوند کر رہی ہے اور دکن کی مقامی عشقیہ روایت اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہے[...]۔ ولی دکن کے لوک حسن، لوک عشق اور لوک کرداروں کا آخری شاعر بھی تھا۔'' [۳۶]

لکھنوی تہذیب کی فکری اور عسکری مجہولیت کے حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا طرز تحریر دیکھیے:

''فکری اور عسکری مجہولیت کے نتیجہ میں لکھنو کی تہذیب نے اپنی معاشرتی فعالیت کو ثقافتی سطحوں پر بحال کرنے کی کوششیں کیں۔ وہ قوت اور توانائی جو فکر و عمل اور عسکری زندگی میں صرف نہ ہو سکتی تھی اب فن اور ثقافت کے میدان میں صرف ہونے لگیں۔'' [۳۷]

نظیر اکبر آبادی کے عہد کا نقشہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''نظیر اپنے عہد کے ''مبتلائے زر'' معاشرے کی داستان سناتا تھا۔ جو زر کے حصول کے لیے اخلاقی نظام کو تہ و بالا کر رہا تھا۔ سرمائے کے انحطاط کے سبب صدیوں پرانی اقدار ریزہ ریزہ ہو گئی تھیں۔ ملکی نراجیت اور نو آبادیاتی نظام کے منفی اثرات سے ہندوستانی معاشرہ بدترین اقتصادی بحران سے گزر رہا تھا۔'' [۳۸]

دلی پر انگریزوں کے مکمل قبضے کی صورتِ حال کو ڈاکٹر تبسم کاشمیری ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''اب ہندوستان میں برطانوی اقتدار اعلیٰ کی برتری مسلمہ ہو چکی تھی۔ مغلیہ اقتدار کی روایتی علامت بھی بری طرح گہنا گئی تھی۔ لال قلعہ جو ہندوستان کے اقتدارِ اعلیٰ کا سرچشمہ سمجھا جاتا تھا، اب برطانوی سرکار کے جھنڈے تلے لانے کے انتظامات مکمل کر لیے گئے تھے۔'' [۳۹]

خطوط غالب پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا بیان دیکھیے:

''غالب نے اپنے ذہن کے نہاں خانوں میں کبھی یہ سوچا بھی نہ ہوگا کہ جن لوگوں کو وہ خطوط لکھ رہے ہیں۔ ایک دن یہ لوگ خطوط کے سٹیج پر ایک کردار کے طور پر ابھریں گے اور ان خطوں کے ساتھ ساتھ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔'' [۴۰]

طوالت سے بچتے ہوئے صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے جو اردو ادب کی تاریخ کے مختلف حصوں اور مختلف شخصیات پر مشتمل ہیں۔ ان مثالوں میں ان کے اسلوب کی سنجیدہ، شگفتہ اور تخلیقی طرز سامنے آئی ہے۔ ان کے الفاظ کا چناؤ اور تخیل کی بلندی منفرد ہے۔ الفاظ کے چناؤ میں مختلف تراکیب اور علمی اصطلاحات کا بیان بھی بصیرت

افروز ہے۔ اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس پیدا نہیں ہوتا ہے کہ واقعات میں تسلسل برقرار نہیں ہے بل کہ ایک کلیت کا احساس زور پکڑتا ہے۔ ان کے اسلوب کی ایک منفرد صورت یہ بھی ہے کہ اس میں فکشن کی طرز پر ایک کہانی بیان ہوتی ہے لیکن وہ کہانی کی ایسی صورت نہیں بنتی جو تحریر کے علمی، تحقیقی اور تنقیدی حُسن میں عیب کی صورت پیدا کردے۔ الفاظ، تراکیب اور لفظوں کے چناؤ میں لسانی رموز و علائم کا خیال نہایت بلیغ صورت سے ملتا ہے۔ شاعرانہ تخیل بھی موجود ہے لیکن تحقیق و تدوین اور تنقید کی علمی زبان اور مباحث سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ تحقیق جیسے مشکل اور خشک موضوع کو ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اپنے تخیل، شعور، تنقیدی بصیرت اور واقعہ نگاری کے فن میں مہارت کے سبب نہایت شگفتہ وقیع اور بلیغ بنادیا ہے جس کو پڑھتے ہوئے کسی قسم کی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی ہے۔ اسے تخلیقی نثر کہا جائے تو مناسب ہوگا۔اسی نقطہ نظر کو ڈاکٹر محمد حسن اپنے مضمون میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> ''تبسم کاشمیری نے پورے اُردو ادب کو ایک اکائی کی طرح دیکھا اور سمجھا ہے اور اسی اعتبار سے اسے تولنے اور پرکھنے کی کوشش کی ہے یہ کوشش دکنی دور کے سلسلے میں خاصی دشوار تھی مگر اسے بڑی سہولت اور خاصے صبر و توازن سے انجام دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے دکنی الفاظ اور تراکیب جا بجا راستہ روکتی ہیں اور ادب فہمی میں رکاوٹ بنتی ہیں مگر تبسم صاحب کا اندازِ تنقید اسے عبارت کے متن میں بڑی خوب صورت سے کھپاتا چلا جاتا ہے اور ان کی جمالیاتی کیفیات کو جہاں تک ہوسکا ہے برقرار رکھتا ہے۔''[۴۲]

ڈاکٹر محمد حسن نے اپنی رائے میں ادب کی کلیت کا ذکر کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے ہر اعتبار سے ادبی تاریخ کے متن کو پرکھا اور تولا ہے حتی الامکان مشکل اور غیر واضح خیالات کو نہایت محنت، مشقت اور جہد مسلسل سے عبور کیا ہے۔ اس کٹھن اور ادب ناشناس رویے کو ہر صورت اپنے آپ سے دور رکھا ہے۔ ان کے منفرد تنقیدی بیان سے عبارت میں نکھار اور چمک پیدا ہوتی گئی۔ بہ حیثیت مجموعی ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے اصول وضوابط اور تاریخ کے نئے تصورات کا ذکر اپنی کتاب کے دیباچے اور دوسرے مضامین میں کیا ہے۔ ان کی عملی صورت ہمیں ان کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔ یہ بجا ہے کہ ابھی تک یہ کام پورے اردو ادب کی نمائندہ نہیں ہے۔ اس کتاب میں ابتدا سے لے کر 1857ء تک کے ادب کی متوازن اور منضبط تاریخ پیش کی گئی ہے۔ پر امید ہوں کہ اس وقیع کام کا دوسرا حصہ بہت جلد تکمیل کے مراحل سے گذر کر قارئین کے ہاتھوں میں ہوگا۔

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اُردو ادب کی تاریخ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۹

۲۔ ایضاً ، ص ۹

۳۔ ڈاکٹر عامر سہیل و نسیم عباس، مرتبین، ادبی تاریخ نویسی، لاہور: پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، ۲۰۱۰ء،

ص۸۷، ۸۸

۴۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اُردو ادب کی تاریخ، ص۱۶۳

۵۔ ایضاً ، ص۳۰۷۔۳۰۸

۶۔ ایضاً ، ص۳۱۶۔۳۱۷

۷۔ ایضاً ، ص۳۴۸

۸۔ ایضاً ، ص۳۸۸۔۳۸۹

۹۔ ایضاً ، ص۳۸۹

۱۰۔ ایضاً ، ص۳۹۷

۱۱۔ ایضاً ، ص۴۷۰۔۴۷۱

۱۲۔ ایضاً ، ص۴۷۲

۱۳۔ ایضاً ، ص۳۴۔۳۵

۱۴۔ ایضاً ، ص۲۴۹

۱۵۔ ایضاً ، ص۲۶۵

۱۶۔ ایضاً ، ص۳۰۳، ۳۰۷

۱۷۔ ایضاً ، ص۳۸۵

۱۸۔ ایضاً ، ص۳۸۸

۱۹۔ ایضاً ، ص۳۹۷۔۳۹۸

۲۰۔ ایضاً ، ص۳۹۸

۲۱۔ ایضاً ، ص۸۵۔۸۶

۲۲۔ ایضاً ، ص۵۴۲

۲۳۔ ایضاً ، ص۴۵۳۔۴۵۴

۲۴۔ آل احمد سرور، ''اُردو اور ہندوستانی تہذیب''، مشمولہ اُردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب، مرتبہ: ڈاکٹر کامل قریشی، دلی: اُردو اکادمی، ۱۹۸۷ء، ص

۲۵۔ تبسم کاشمیری، اردو ادب کی تاریخ، ص۵۶۰

۲۶۔ ایضاً ، ص۵۹۳

۲۷۔ ایضاً ، ص۶۷۸

۲۸۔ ایضاً ، ص۷۷۸۔۷۷۹

۲۹۔ ایضاً ، ص۶۸۲

۳۰۔ ایضاً ، ص۶۸۲

۳۱۔ ایضاً ، ص۷۶۰

۳۲۔ ایضاً ، ص ۸۱۸

۳۳۔ ڈاکٹر عامر سہیل و نسیم عباس احمر، مرتبین، ادبی تاریخ نویسی، ص۴۵۴

۳۴۔ ڈاکٹر ریاض قدیر، ''اُردو ادب کی تاریخ اور تاریخی وژن''، مشمولہ مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین، جلد: ۸۶، ۲۰۱۱ء، ص۱۰۰

۳۵۔ ڈاکٹر عامر سہیل، نسیم عباس احمر، مرتبین ادبی تاریخی نویسی، ص۴۷۲

۳۶۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری، اُردو ادب کی تاریخ، ص ۲۲۷

۳۷۔ ایضاً ، ص ۳۸۷

۳۸۔ ایضاً ، ص۵۵۴

۳۹۔ ایضاً ، ص۶۶۳

۴۰۔ ایضاً ، ص۷۳۹

۴۱۔ ڈاکٹر عامر سہیل و نسیم عباس احمر، مرتبین، ادبی تاریخی نویسی، ص۴۵۲